راہِ دعوت کے مراحل

خُرّم مُرادؒ

منشورات

00132 / 8

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

درس قرآن کے لیے میں نے جن آیات کا انتخاب کیا ہے، یہ دعوت حق کی ذمہ داریوں اور اس کی تیاری کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ یہ آیات نبوت کے بالکل ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہیں، اور سورۂ مزمل کے شروع میں ان کو رکھا گیا ہے۔ صحیح روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلی وحی اقرأ یعنی پڑھنے کا پیغام لے کر نازل ہوئی، اور اس کے نتیجے میں قرآن مجید کا نزول تسلسل کے ساتھ شروع ہو گیا۔ اس کے بعد دوسری وحی کچھ عرصے کے بعد سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات کی صورت میں نازل ہوئی۔

اگر غور کیا جائے تو ان دونوں کے درمیان ایک بڑا گہرا رشتہ پایا جاتا ہے۔ گویا قرآن مجید کی امانت سپرد کرنے کے بعد جو پہلی ذمہ داری ایک فرد پر عائد ہوتی ہے، جس کے پاس قرآن مجید کی امانت موجود ہو، وہ یہ ہے کہ وہ دعوتِ حق کے لیے کھڑا ہو جائے اور اپنی قوم کو، اپنے گردوپیش کو، اپنے سارے متعلقین کو اللہ کی طرف بلائے، اور اس کی نافرمانی کی صورت میں تنبیہ کرے، اور فرماں برداری کی صورت میں خوش خبری سنائے۔ ان دونوں وحیوں کے درمیان نہ نماز کا حکم نازل ہوا، نہ روزہ، حج اور زکوٰۃ کا اور نہ دوسرے قانونی اور اخلاقی احکام نازل ہوئے۔

معلوم یہ ہوا کہ قرآن مجید کا علم اور قرآن کی امانت، یہ دونوں ایسی چیزیں ہیں کہ جس کے بعد کوئی آدمی گھر بیٹھا نہیں رہ سکتا، بلکہ اس کو کھڑے ہو کر اس پیغام کو دوسروں تک پہنچانا چاہیے۔ یہ پیغام مختصر ضرور ہے مگر اپنے ساتھ بڑی بھاری ذمہ داری لے کر آتا ہے۔

میں نے درس کے لیے جو حصّہ منتخب کیا ہے، اس میں بھی اس بات کا ذکر ہے کہ یہ ذمہ داری کتنی

گراں قدر ذمہ داری ہے، اور یہ کام کتنا اہم کام ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت اور وحی کی صورت میں ہمارے سپرد کیا ہے۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے کن صفات کی ضرورت ہے، اور وہ کون سی صفات ہیں جن کے بغیر اس کو بہتر انداز میں ادا نہیں کیا جا سکتا۔

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمo

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِo

یٰٓاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ o قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلاً o نِّصْفَہٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْہُ قَلِیْلاً o اَوْ زِدْ عَلَیْہِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلاً o اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلاً ثَقِیْلاً o اِنَّ نَاشِئَۃَ الَّیْلِ ھِیَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ اَقْوَمُ قِیْلاً o اِنَّ لَکَ فِی النَّھَارِ سَبْحًا طَوِیْلاً o وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلاً o (المزمل ۷۳:۱۔۸)

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے، رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم، آدھی رات، یا اس سے کچھ کم کر لو، یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو، اور قرآن کو خوب ٹھیر ٹھیر کر پڑھو۔ ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔ درحقیقت رات کا اُٹھنا نفس پر قابو پانے کے لیے بہت کارگر اور قرآن ٹھیک پڑھنے کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ دن کے اوقات میں تو تمھارے لیے بہت مصروفیات ہیں۔ اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کرو اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو رہو۔

سب سے پہلے طرز خطاب قابل غور ہے۔ فرمایا گیا کہ اے چادر لپیٹنے والے۔ کچھ احادیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جب نبی کریم ﷺ پر پہلی وحی نازل ہوئی، تو آپ ﷺ کپکپاتے ہوئے گھر آئے اور آپ ﷺ کے الفاظ تھے زملونی، زملونی، مجھے چادر اوڑھا دو، مجھے چادر اوڑھا دو۔ یہ تو اس کا واقعاتی پس منظر ہے، لیکن صحیح معنوں میں اس وقت داعی حق کی جو نفسیاتی کیفیت تھی، اس کا نقشہ بھی کھینچ دیا گیا ہے۔ ایک یکتا اور تنہا آدمی، ایسی بات اپنی قوم

کے سامنے بیان کرنے کا ذمہ دار ٹھیرایا گیا تھا، جس کی ہر بات اس قوم کے لیے اجنبی تھی، اور قوم اس کی مخالفت کرنے والی تھی، اور بظاہر اس بات کا کوئی امکان نہ تھا کہ عرب وعجم اور ہر جگہ یہ کلمہ غالب آجائے گا۔

جب کام بہت دشوار ہو اور منزل دور ہو، اور یہ احساس بھی ہو کہ بہت سارے کام کرنا ہیں، شاید آپ کو بھی اس کا تجربہ ہوا ہوگا، کہ آدمی کا دل چاہتا ہے کہ سب کچھ بھول کر اور چادر لپیٹ کر لیٹ جائے۔ چنانچہ اس خطاب میں داعی کو سب سے پہلے جو احساس ذمہ داری ہوتا ہے، اور اس احساس کے پیش نظر وہ جو بوجھ محسوس کرتا ہے اور دل شکستگی کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ سمیٹ دی گئی ہے۔

اس کے بعد پھر یہ ہدایت دی گئی ہے کہ رات کو کھڑے رہو، آدھی رات، اس سے کچھ کم یا اس سے کچھ زیادہ۔ قیام اللیل، اللہ کے حضور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا، اس کی تسبیح کرنا، اس کی بڑائی بیان کرنا، اس کے آگے سجدہ ریز ہونا، گڑگڑانا، اپنی تمنائیں، آرزوئیں اور عاجزی پیش کرنا ہے۔ یہ قیام اللیل کا اصل مقصد ہے جس کی وجہ سے اس کو شروع میں فرض کیا گیا اور بعد میں اس کی بڑی اہمیّت اور فضیلت بیان کی گئی ہے۔

کئی احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبوت کے ابتدائی دور میں جو نماز فرض تھی، وہ رات کی نماز تھی۔ پھر آہستہ آہستہ تین نمازیں ہوئیں اور معراج کے موقع پر پانچ نمازیں فرض ہوئیں۔ اس کے بعد اگرچہ رات کی نماز کی فرضیت ختم کر دی گئی، لیکن بے شمار جگہ قرآن مجید نے رات کی نماز اور رات کو اللہ کے حضور میں کھڑے ہونا اور اللہ کے کلام کی تلاوت کرنے کو ایک ایسی صفت قرار دیا ہے جو مومنین، محسنین اور داعیان حق کے لیے لازمی ہے اور جس کو انھیں اختیار کرنا چاہیے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ پہلو کہ روزمرہ مصروفیات، بیماری و دیگر مسائل اور اللہ کی راہ میں بھرپور جدوجہد اور جہاد کی بنا پر یہ ممکن نہ ہو کہ ہر آدمی اس کا اہتمام کر سکے، چنانچہ اس کی فرضیت ہٹالی گئی، لیکن اس کی فرضیت ہٹانے سے اس کے فضائل میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔

کیا یہ صرف اس بات کی تربیت تھی کہ لوگ رات کو اللہ کے حضور میں کھڑے ہو کر اپنے دل کا تعلّق اس سے بڑھائیں، یا اس پوری تیاری کا کوئی تعلّق دعوت حق کے اس عظیم الشان کام سے بھی تھا، جو نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے بعد قیامت تک کے لیے آپ ﷺ کی اُمت کے سپرد ہونے والا تھا؟

اگر آپ غور کریں تو یہ محسوس کریں گے کہ قیام اللیل اور دعوت حق، دونوں کے درمیان بڑی گہری مماثلت پائی جاتی ہے، اور یہ بڑی نادر، جامع اور معنی خیز تشبیہ ہے۔ اس پر آپ جتنا غور کریں گے، اس کے مختلف پہلو کھلتے چلے جائیں گے۔

رات کو کھڑا ہونے والا اس وقت کھڑا ہوتا ہے جب سب لوگ سو رہے ہوتے ہیں۔ دعوت حق کا کام بھی اسی دل گردے کا مطالبہ کرتا ہے کہ جب ساری انسانیت سو رہی ہو، غفلت کا شکار ہو اور گردوپیش کے لوگ محوِ خواب ہوں، اس وقت بھی داعی حق کو کھڑے ہو کر اپنی دعوت کا کام کرنا ہوتا ہے، اور اس کا فرض ہے کہ لوگوں تک اپنی بات پہنچائے۔

رات کے وقت کھڑے ہونے کے لیے اپنی سب سے زیادہ محبُوب چیز، یعنی نیند کی قربانی اور گرم گرم بستر چھوڑنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ دعوت حق کی راہ میں بھی بے شمار محبُوب چیزوں کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ زندگی کے سفر میں جگہ جگہ سائے ملتے ہیں جہاں آدمی کا دل چاہتا ہے کہ کچھ دیر بیٹھ جائے، جگہ جگہ نرم بستر نظر آتے ہیں اور دل چاہتا ہے کہ لیٹ جائے اور ذرا سستا لے۔ اس کا دل اس وقت بھی اٹکتا ہے جب وہ تپتی ہوئی دھوپ میں ہو، جب کہ چاروں طرف سے مصائب کا انبار ہو، یا گھٹا ٹوپ اندھیرے ہوں کہ جہاں روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آتی کہ وہ کیسے کھڑا ہو کر اعلانِ حق کرے۔ چنانچہ رات کا قیام اس بات کی بھی تربیت دیتا ہے کہ صرف نیند ہی کی قربانی نہیں دینی اور صرف وہی نرم بستر ہی نہیں چھوڑنا جس سے آدمی سوتا ہوا اٹھتا ہے، بلکہ مال و دولت اور دنیاوی نعمتوں اور مفادات کے بہت سارے بستر اور سائے ایسے اور بھی ہیں جن کو چھوڑ کر، کھڑے ہو کر دعوتِ حق کا کام کرنا ہوگا۔

اس کا ایک پہلو رات کی تاریکی کے حوالے سے بھی ہے۔ آج کل گھڑیاں میسر ہوتی ہیں اور ہم دیکھ لیتے ہیں کہ کیا وقت ہوا ہے، اور اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ صبح کس وقت ہوگی، یا آسمان پر ستارے ہوں تو تھوڑا بہت اندازہ ہو جاتا ہے۔ مگر جب رات کی تاریکی چھائی ہوئی ہو، تو یہ اندازہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ صبح کب ہوگی، نور کی پہلی کرن کب طلوع ہوگی۔ اسی طرح جو لوگ حق اور اسلامی حکومت کے قیام کے لیے کھڑے ہوئے ہوں، ان کے لیے یہ اندازہ کرنا کوئی آسان کام نہیں کہ کامیابی کا سورج کب طلوع ہوگا۔ انسان یہ سوچتا رہتا ہے کہ شاید رات بہت طویل ہے، یا صبح کبھی نہیں ہوگی، یا شاید اب ہمیشہ اندھیرا ہی رہے گا۔ رات کا قیام دراصل اس بات کی بھی تعلیم دیتا ہے کہ اگرچہ رات اندھیری اور طویل ہو، اور دعوت حق کی جدوجہد طویل ہو جائے، اور اس راہ میں بہت سی قربانیاں دینا پڑیں لیکن یہ امید رکھنی چاہیے کہ بہرحال ایک وقت آئے گا جب صبح ضرور طلوع ہوگی۔ دراصل انسان کو اندازہ نہیں ہوتا اور وہ جلد بازی کرتا ہے، اور وہ یہ بھول جاتا ہے کہ اس کا کام تو یہ ہے کہ کھڑے ہو کر اپنے رب کی کبریائی بیان کرے، اور اس کے کلام کی تلاوت کرے۔

یہ وہ مختلف پہلو ہیں جن کی بنا پر رات کا قیام دعوت حق سے ایک گہری مماثلت رکھتا ہے، اور اس کے لیے تربیت کا اہم اور موثر ذریعہ ہے۔

اس حوالے سے آخری چیز جو بڑی اہم ہے، وہ یہ ہے کہ دعی الی اللہ یکّہ وتنہا ہوتا ہے، مگر دعوت کی کامیابی پر اس کا یقین پختہ ہوتا ہے، دعوت حق کا جو بیج غار حرا میں نبی کریم ﷺ کے ہاتھوں ڈالا گیا، اور جو بالآخر ایک تناور درخت اور شجر سایہ دار کی صورت میں ابھرا، جس نے دُنیا بھر کے اوپر سایہ کیا اور دنیا نے اس کے ثمرات سمیٹے، اگرچہ آپ ﷺ تنہا تھے مگر دعوت کی کامیابی کا آپ ﷺ کو پختہ یقین تھا۔ ابتدا میں جب آپ ﷺ تن تنہا تھے، آپ ﷺ کے ساتھ کوئی نہ تھا، جب مکے کی سنگلاخ چٹانیں، ریت کے ذرات اور ہر چیز مخالف دکھائی دیتی تھی، اس وقت بھی آپ ﷺ کو اس بات کا پختہ اور کامل یقین تھا کہ ایک وقت آئے گا جب یہ دعوت

عرب وعجم میں ہر طرف پھیل جائے گی، اور اسی بات کی آپ ﷺ اپنی قوم کو تعلیم دیتے تھے۔ رات کو جب سارے انسان سو رہے ہوں تو اسی اعتماد اور اسی یقین کے ساتھ آدمی اپنی اس ذمہ داری کو محسوس کرتا ہے، کہ مجھے اپنے رب کا کام کرنا ہے، اور بالآخر اس کے حضور میں کھڑے ہونا ہے۔

اس کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ قیام اللیل دراصل رہبانیت کی دعوت دینے کے لیے نہیں تھا، بلکہ یہ دن کو کام کرنے کی تیاری کے لیے تھا، اور اس کے لیے نفس میں جذبہ وولولہ اور وہ صفات پیدا کرنے کے لیے تھا جو داعی حق کے لیے ناگزیر ہوتی ہیں۔ اس بات کو یہاں خود قرآن مجید نے بھی واضح کر دیا ہے، فرمایا:

اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلاً ثَقِیْلاًo (المزمل ۷۳: ۵)

اس لیے کہ ہم آپ پر ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں۔

یہ قول یا بات کیا تھی؟ یہ خدا کا پیغام، ہدایت الٰہی کی نعمت اور وحی کی دولت تھی جو حضور ﷺ کے سپرد کی جا رہی تھی۔ میں اس حصّے کی تفسیر پر بعد میں آؤں گا، اس لیے کہ میں اس آیت کا ربط واضح کرنا چاہتا ہوں۔

قول ثقیل اس کو اس لیے کہا گیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی فرد، اور کسی قوم کو اپنی ہدایت جیسی نعمت سے سرفراز کر دے، تو اس پر پہلی ذمہ داری یہ عائد ہوتی ہے کہ وہ کھڑے ہو کر اس کی طرف دوسروں کو دعوت دینا شروع کر دے۔ اگر اس کا ماحول، گرد وپیش، اور اس کی قوم اس سے ناآشنا ہے، تو پھر وہ خود اس پر کتنا ہی عمل کیوں نہ کرے، وہ اس کے لیے کافی نہیں ہے۔

میری نظر میں قرآن کی نعمت حاصل ہونے کے بعد یہ ایک ایسا فرض ہے جسے قرآن مجید میں ایک ایسی بھاری ذمہ داری قرار دیا گیا ہے کہ اگر ہم نے اس کو کسی پہاڑ پر اتارا ہوتا تو تم دیکھتے کہ پہاڑ اس کی خشیت سے پھٹ جاتا، ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ مفسرین نے اس کی مختلف تعبیریں کی ہیں۔ میں جس تعبیر کو پسند کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ دراصل اس قرآن کو وصول کرنے اور حاصل کرنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ انسان کے اوپر شہادت حق کی ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے،

اور یہ ذمہ داری دنیا کی عظیم ترین ذمہ داری ہے۔ اس لیے کہ اس بات پر اللہ تعالیٰ نے اپنے سارے انبیا علیہم السلام اور انبیا علیہم السلام کے بعد آنے والے ان متبعین سے یہ میثاق لیا ہے کہ وہ اللہ کی صفات کو ظاہر کریں گے، اس کے پیغام کو عوام الناس تک پہنچائیں گے، اور اس کو چھپا کر نہیں بیٹھیں گے۔ پہاڑوں کے پھٹ جانے کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ دراصل یہ وہ امانت تھی جس کو پہاڑوں نے اٹھانے سے انکار کر دیا، لیکن انسان نے اس امانت کو اٹھا لیا ہے۔ یہ امانت اللہ کی کتاب اور ہدایت ہے جو اس کے سپرد کی گئی ہے۔

قرآن مجید میں ایک بڑی عجیب چیز آپ محسوس کریں گے، کہ اس نے مختلف قسم کی غلطیوں اور گناہوں کے لیے مختلف قسم کی سزاؤں کا ذکر کیا ہے، لیکن ایک سزا اس نے خاص طور پر ایک جرم کے لیے مخصوص کی ہے، اور وہ سزا لعنت کی ہے اور یہ کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس جرم کا ارتکاب کرنے والوں کی طرف نہ دیکھے گا اور نہ ان سے کلام کرے گا۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جنھوں نے اللہ سے اپنے کیے ہوئے عہد، یعنی شہادت حق کی ذمہ داری ادا نہیں کی ہوگی۔ چنانچہ فرمایا:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْھُدٰی مِنْ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰہُ لِلنَّاسِ فِی الْکِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِکَ یَلْعَنُھُمُ اللّٰہُ وَ یَلْعَنُھُمُ اللّٰعِنُوْنَ o اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَبَیَّنُوْا فَاُولٰٓئِکَ اَتُوْبُ عَلَیْھِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ o (البقرہ ۲:۱۵۹۔۱۶۰)

جو لوگ ہماری نازل کی ہوئی روشن تعلیمات اور ہدایات کو چھپاتے ہیں، درآں حالیکہ ہم انھیں سب انسانوں کی رہنمائی کے لیے اپنی کتاب میں بیان کر چکے ہیں، یقین جانو کہ اللہ بھی ان پر لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔ البتہ جو اس سے باز آ جائیں اور اپنے طرز عمل کی اصلاح کر لیں اور جو کچھ چھپاتے تھے، اسے بیان کرنے لگیں، ان کو معاف کر دوں گا اور میں بڑا درگزر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔

یہ لعنت اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب و ہدایت کو اس لیے اتارا کہ لوگ اس سے ہدایت پائیں اور انسانیت کو رہنمائی ملے، لیکن انھوں نے اس کو چھپایا اور اس کے اوپر سانپ بن کر بیٹھ گئے۔ ان پر فرشتوں کی لعنت اس لیے کہ انھوں نے اس مقدس امانت کو ان تک پہنچایا مگر انھوں نے اسے آگے منتقل نہ کیا، اور تمام انسانوں کی لعنت اس لیے کہ وہ ہدایت سے محروم ہو کر گمراہی کے اندھیروں میں بھٹکتے رہے اور ان تک ہدایت نہ پہنچ سکی۔ شہادت حق کی اس کٹھن ذمہ داری کی بنا پر یہ قول ثقیل ہے۔

قرآن مجید کا صرف علم ہو جانا، اور اس بات پر ایمان رکھنا کہ یہ اللہ کی کتاب ہے، اس کے نتیجے میں یہ عظیم الشان ذمہ داری ہر مسلمان پر عائد ہو جاتی ہے کہ وہ اللہ کی کتاب کے لیے گواہ بن کر کھڑا ہو، اور اس کی دعوت دوسروں تک پہنچائے۔ اب ظاہر ہے کہ کتاب کا پہنچانا اور اس چیز کی طرف دعوت دینے کے لیے سب سے زیادہ گہرا قلبی تعلّق اسی کتاب کے ساتھ ہونا چاہیے، اور سب سے زیادہ فہم اور سمجھ بھی اسی کی ہونی چاہیے۔ یہی کتاب اس کا سرچشمہ ہے، کہ اس کے ایمان کے بیج کی آبیاری ہو، اور وہ پروان چڑھے۔ اس لیے فرمایا گیا ہے: وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلاً ، اور قرآن خوب ٹھیر ٹھیر کر پڑھو!

نماز میں کھڑے ہونے کے بہت سے مقاصد ہیں۔ اس سے اللہ کی حضوری کا احساس پیدا ہوتا ہے، اللہ کے آگے عاجزی اور انکسار آدمی کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اسی حالت میں جب وہ اپنے آپ کو اللہ کے سامنے حاضر سمجھ کے قرآن پڑھتا ہے تو اس کا قرآن مجید کے ساتھ گہرا تعلّق پیدا ہوتا ہے۔ قرآن مجید سے تعلّق کے حوالے سے یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ قرآن مجید کو اپنے نفس کے اندر اور اپنی روح کے اندر جذب کیے بغیر کوئی آدمی دعوت حق اور شہادت حق کا فریضہ سرانجام نہیں دے سکتا۔ اسی لیے فرمایا:

اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیْلِ ھِیَ اَشَدُّ وَ طْاً وَّ اَقْوَمُ قِیْلاًo اِنَّ لَکَ فِی النَّھَارِ سَبْحًا طَوِیْلاًo وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ وَ تَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلاًo (المزمل ۷۳:۶۔۸)

درحقیقت رات کا اُٹھنا نفس پر قابو پانے کے لیے بہت کارگر اور قرآن ٹھیک پڑھنے زیادہ موزوں ہے۔ دن کے اوقات میں تو تمھارے لیے بہت مصروفیات ہیں۔ اپنے رب کے نام کا ذِکر کیا کرو اور سب سے کٹ کر اُسی کے ہو رہو۔

رات کے قیام کے لیے دو لفظ استعمال ہوئے ہیں: **اشد وطأً** اور **اقوم قیلا** ۔ وطأً کہتے ہیں کسی چیز کو روندنے کو۔ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کے اندر جو بھی کمزوریاں اور خامیاں ہیں، یا اس کے کردار میں جو اونچ نیچ ہے یا اس کی آرزوؤں، جذبات اور تمناؤں میں جو کمی بیشی ہے، ان سب کو روند کر دعوت حق کے لیے یہ راہ ہموار کرتا ہے، اور اس میں یہ سب سے زیادہ مفید اور نافع ہے۔ دراصل دعوت حق کے کام، رات کو اللہ کے حضور میں کھڑے ہو کر قیام کرنے اور قرآن کی تلاوت کی باہمی مماثلت پر اگر آپ غور کریں گے، تو آپ محسوس کریں گے کہ یہ کام اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ آدمی دنیا میں اپنے نفس کو ہر چیز سے فارغ کر کے صرف دعوت کے کام کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دے۔

نفس کو فارغ کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آدمی دنیا کے ہر کام کو ترک کر دے، یا اس کو چھوڑ دے۔ دراصل اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کے تمام افکار و مساعی پر یہ بات غالب ہو کہ لوگوں تک یہ کلمہ حق پہنچے اور وہ اس کو قبول کر لیں، خواہ وہ اس کے گھر میں ماں باپ، بہن بھائی، بیوی بچے ہوں یا اہل محلّہ یا پھر قوم کے افراد۔ یہ بات بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ جب تک ان تک قرآن کی دعوت نہ پہنچے، قرآن کی نعمت نہ پہنچے، اور جب تک آپ نے ان تک یہ پیغام نہیں پہنچایا کہ حق کیا ہے، وہ اس تک پہنچنے سے قاصر ہیں۔ روزِمحشر وہ آپ کا گریبان پکڑ سکتے ہیں۔ اس لیے اس کی تیاری کرنے کی ضرورت ہے، اور یہی فکر سب سے زیادہ غالب فکر بن جائے تو پھر آدمی اس کام کو انجام دے سکتا ہے۔

دراصل ہمارے نفس میں بہت ساری محبتیں، تمنائیں اور آرزوئیں ہوتی ہیں۔ نگاہ جگہ جگہ جا کر ٹھیرتی ہے، دل جگہ جگہ اٹکتا ہے، اور جہاں نگاہ جم جائے وہاں دل بھی اٹک جاتا ہے۔

اس لیے قرآن مجید میں اس بات کی ہدایت کی گئی ہے کہ وَ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ○ (طٰہٰ ۲۰:۱۳۱) ''اور نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھو دنیوی زندگی کی اُس شان وشوکت کو جو ہم نے ان میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہے۔ وہ تو ہم نے انھیں آزمایش میں ڈالنے کے لیے دی ہے، اور تیرے رب کا دیا ہوا رزقِ حلال ہی بہتر اور پائندہ تر ہے۔'' ایک دوسرے مقام پر اسے دُنیا کی چند روزہ زندگی کا سامان قرار دیا ہے [آل عمران ۳:۱۱۴]۔ گویا دنیا کے ظاہری ساز وسامان میں اگر کہیں تم اٹک گئے تو دعوت حق کا کام نہیں ہوسکتا۔ پہلے فرمایا کہ ہم نے دنیا میں خوش حال لوگوں کو جو کچھ عطا کیا ہے، ان کا لائف اسٹائل یا معیار زندگی یا خوش حالی، یہ سب ان کی آزمایش کے لیے ہے، لہٰذا ان ساری چیزوں سے اپنے دامن کو بچانا، اپنی نگاہوں کو محفوظ رکھنا اور دل ونگاہ دونوں کو اللہ کے ساتھ لگانا، تاکہ اس کے دین کی دعوت کا کام ہوسکے۔ اس کے لیے نفس پر قابو پانے کی ضرورت ہے، اور یہ رات کو اللہ کے حضور میں کھڑے ہوکر قرآن کی تلاوت کرنے سے حاصل ہوسکتا ہے۔ اس لیے جو آدمی اس کے لیے تیار ہو، کہ روز رات کو اپنی نیند قربان کرے، روز رات کو اپنا بستر چھوڑے، اور اس کے ذریعے اس کو یہ احساس ہو کہ یہ چیزیں عملی زندگی میں بھی چھوڑنا پڑیں گی، تو پھر وہ محض ظاہری ساز وسامان کے لیے دعوت حق کے کام کو پس پشت نہیں ڈال سکتا۔

دوسری بات ہے: اَقْوَمُ قِيْلًا ○ (المزمل ۷۳: ۶) اور قرآن ٹھیک پڑھنے کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ ہمارے مفسرین نے کئی انداز میں اس کی تعبیر کی ہے، اور اس کے معنی بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں جو مفہوم مجھے پسند ہے، وہ یہ ہے کہ اس وقت جو کلام آدمی اللہ تعالیٰ سے کرتا ہے، وہ ایسا ہے کہ سیدھا دل میں جا کر اترتا ہے۔ اس لیے اس وقت قرآن کی تلاوت نفس اور روح کے لیے غور وفکر اور فہم کے لیے سب سے زیادہ نافع اور مفید ہے۔ چنانچہ فرمایا:

اِنَّ لَكَ فِی النَّهَارِ سَبۡحًا طَوِیۡلاًo(المزمل ۷۳:۷)

دن کے اوقات میں تو تمھارے لیے بہت مصروفیات ہیں۔

یعنی ہم نے رات میں قرآن کی تلاوت اور اس کے ذریعے نفس کی تربیت کا حکم اس لیے دیا ہے کہ دن میں تمھارے لیے ایک شغل طویل ہے، اور تمھیں تلاوتِ قرآن اور خدا سے قرب کے لیے فرصت نہیں ملے گی۔ سبح سے تسبیح کا لفظ نکلا ہے۔ اس کے اصل معنی تیزی کے ساتھ دوڑنے کے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ لفظ چاند اور سورج کی گردش کے لیے بھی استعمال ہوا ہے، جو ایک ضابطے کے تحت خلا میں گردش کرتے رہتے ہیں، اور یہ لفظ دعوت حق کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ میرے نزدیک یہاں یہ انھی معنوں میں استعمال ہوا ہے، کہ تمھارے دن کی ساری گھڑیاں ایک طویل مشغلے میں گزریں گی، شاید تمھیں اس کی فرصت نہ ملے کہ تم قرآن سے اس طرح اللہ تعالیٰ کے قریب آسکو، اور اس کے بغیر دعوت حق کا کام نہیں ہوسکتا۔ اس لیے ہم نے تمھاری تربیت کے لیے، نفس کے تزکیے اور تمھاری تیاری اور تمھارے اندر مطلوبہ صفات پیدا کرنے کے لیے یہ انتظام کیا ہے۔

اس کے بعد آگے چل کر کچھ مزید ہدایات دی گئی ہیں۔ ابتدا میں ایک مخصوص ہدایت دی گئی تھی کہ جو تلاوت قرآن اور رات کے قیام تک محدود تھی لیکن اگر ہم غور کریں تو اس سے بہت ساری اندرونی صفات بھی سامنے آتی ہیں جن کا داعیِ حق کے لیے ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ یہاں ان صفات کو عمومی پیرایے میں بیان کیا جارہا ہے۔

وَاذۡكُرِ اسۡمَ رَبِّكَ وَ تَبَتَّلۡ اِلَیۡهِ تَبۡتِیۡلاًo (المزمل ۷۳:۸)

اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کرو اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو رہو۔

ذکر کا لفظ یاد رکھنے اور دھیان رکھنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ذکر کے معنوں میں زبان سے تسبیح اور حمد اور قرآن کی تلاوت شامل ہے، اور یہ ضروری ہے اس لیے کہ اس کے بغیر قدم آگے نہیں بڑھائے جاسکتے۔ جو یہ سمجھتا ہو کہ یہ ایک ایسا کام ہے جو نہیں

ہوسکتا یا تسبیح اور تحمید کا مشغلہ داعیان حق اور اقامت دین کے داعیوں کے لیے نہیں بلکہ صوفیا کے لیے ہے، وہ غلط فہمی میں مبتلا ہے۔

یہ کام ایسا نہیں ہے جس کے لیے آدمی کو کسی گوشے میں جا کر بیٹھنے کی ضرورت ہو۔ قرآن مجید میں دو مقامات پر اس بات کو بڑی خوب صورتی سے واضح کیا گیا ہے۔ ایک مقام سورۂ جمعہ میں آتا ہے جہاں یہ کہا گیا کہ:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَذَرُوا الْبَیْعَ ط ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَo (الجمعۃ ۶۲:۹)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب پکارا جائے نماز کے لیے جمعہ کے دن تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو، یہ تمھارے لیے زیادہ بہتر ہے اگر تم جانو۔

اس طرز بیان کے اندر ایک خاص حکمت پوشیدہ ہے۔ اس میں مقصود نماز کی ظاہری شکل نہیں ہے، بلکہ اصل مقصود نماز سے اللہ کی یاد ہے۔

دوسری جگہ یوں بیان فرمایا گیا ہے:

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْo (طٰہٰ ۲۰:۱۴)

اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔

اگر پانچ وقت نماز پڑھ کر بھی اللہ یاد نہ آئے، نماز کے دوران یا نماز کے بعد بھی اس کی یاد نہ آئے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز اپنا مقصد پورا نہیں کر رہی ہے۔ پھر فرمایا گیا:

فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَo (الجمعۃ ۶۲:۱۰)

پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو، شاید کہ تمھیں فلاح نصیب ہو جائے۔

گویا پہلے اللہ کے ذکر کی طرف بلایا گیا، اور اس کے بعد زمین میں پھیل کر اللہ کے ذکر کی تلقین کی گئی کہ اللہ کے فضل کی تلاش اور زندگی گزارنے میں تم جو کچھ کرو گے، اس میں بھی اللہ کی یاد ہوگی اگر وہ اللہ کی مرضی اور احکام کے مطابق ہو، اور اللہ کی طرف توجہ ہو، اور ہر کام خدا کے لیے خالص ہو۔

سورۃ طٰہٰ میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک جابر بادشاہ کے دربار میں کلمۂ حق کہنے کے لیے بھیجا گیا تو انھوں نے ایک طویل دعا کی:

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ o وَیَسِّرْلِیْٓ اَمْرِیْ o وَ احْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ o یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ o وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ o هٰرُوْنَ اَخِی o اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِیْ o وَاَشْرِكْهُ فِیْٓ اَمْرِیْ o كَیْ نُسَبِّحَكَ كَثِیْرًا o وَّ نَذْكُرَكَ كَثِیْرًا o اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِیْرًا o (طٰہٰ ۲۰:۲۵۔۲۷)

موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا ''پروردگار، میرا سینہ کھول دے، اور میرے کام کو میرے لیے آسان کر دے۔ اور میری زبان کی گرہ سلجھا دے تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں، اور میرے لیے میرے اپنے کنبے سے ایک وزیر مقرر کر دے۔ ہارون علیہ السلام، جو میرا بھائی ہے۔ اس کے ذریعے سے میرا ہاتھ مضبوط کر اور اس کو میرے کام میں شریک کر دے، تاکہ ہم خوب تیری پاکی بیان کریں اور خوب تیرا چرچا کریں۔ تو ہمیشہ ہمارے حال پر نگران رہا ہے۔

ظاہر ہے کہ وہ جو کام کرنے جا رہے تھے وہ کسی خانقاہ میں بیٹھ کر اللہ کا ذکر کرنا نہیں تھا بلکہ اللہ کے پیغام اور دعوت کو ایک جابر بادشاہ کے دربار میں پہنچانے کے لیے جا رہے تھے، اللہ کے بندوں کو اس کی غلامی سے آزاد کروانے کے لیے جا رہے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے جو لفظ استعمال کیا وہ کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر تھا۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے جو ہدایت دی وہ بھی یہی تھی:

وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْo (طٰہٰ ۲۰:۴۲)
اور دیکھو، تم میری یاد میں تقصیر نہ کرنا۔

گویا ایسا نہ ہو کہ تم میرے ذکر میں کوتاہی کر جاؤ، اور اس سلسلے میں سستی برت جاؤ۔ لہٰذا ذکر کا لفظ ان تمام معنوں پر حاوی ہے۔

خیال رہے کہ کام خواہ دعوت حق کا ہو یا اقامت دین کا یا جہاد میں تلوار اٹھانے کا، اس کا آغاز وہیں سے ہوگا کہ آدمی کی زبان اور اس کا دل اللہ کے ذکر میں مشغول اور مصروف رہے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے، بڑی آسانی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے، اگر دھیان اللہ کی طرف رہے اور اس کی طرف توجہ رہے۔

اسی لیے اس کے ساتھ ملا کر فرمایا گیا ہے۔

وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلاً (المزمل ۷۳:۸) اور ہر طرف سے کٹ کر اللہ کے ہی ہو رہو۔

گویا یہ ذکر اسی صورت میں ساری زندگی میں جاری و ساری ہو سکتا ہے جب آدمی ان سارے رشتوں سے کٹ کر صرف اللہ کے ساتھ اپنے دل کا تعلّق جوڑے۔ اصل میں زندگی کی بنیاد تو دل ہے، جہاں دل ہوگا وہیں آدمی کی ساری زندگی ہوگی۔ دل میں اگر اللہ کا خیال ہوگا تو ساری زندگی اللہ کی یاد میں گزرے گی، اور اگر دل اللہ سے غافل ہوگا تو ساری زندگی اللہ سے غفلت میں گزر جائے گی۔ اس لیے فرمایا گیا ہے کہ دل کی ساری توجہ اللہ کی طرف ہونی چاہیے۔

میں نے اس حصّے کو درس قرآن کے لیے اس لیے منتخب کیا کہ ایک طرف تو یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ اللہ کی یاد اور اس کا ذکر زبان سے ہو اور دل میں ہو، اور اس کا اہتمام صرف مخصوص لوگوں کے لیے ہے، جب کہ جو لوگ اقامت دین کا کام کر رہے ہوں، نعرے لگا رہے ہوں، جلوس نکال رہے ہوں، ہنگاموں میں حصّہ لے رہے ہوں، سیاسی جدوجہد کر رہے ہوں، یہ ایک سیاسی مزاج ہے، ان کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسری طرف یہ رجحان ہے کہ سیاست ایک شجرِ ممنوعہ ہے، اور اللہ کے دین کے لیے جدوجہد غلط ہے، اور سب کچھ چھوڑ کر اللہ کی یاد میں

مشغول رہنا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دونوں کا رشتہ آپس میں جوڑے بغیر، اور دونوں کا صحیح امتزاج قائم کیے بغیر اللہ کے دین کا کام نہیں ہوسکتا۔

اگر یہ چیز پیدا ہوجائے کہ ایک طرف ہمارے دل میں اللہ کی یاد ہو، اور اس کے یہ معنی ہیں کہ ہمارا ہر کام اللہ کے لیے خالص ہو، اس کے سامنے حضوری اور جواب دہی کا احساس ہو، ہم جہاں کہیں بھی ہوں نظر خدا پر ہو، اَیْنَ ما کنت تو ہمارا ہر کام اپنے اندر ایک دینی روح رکھے گا، اور ہمارا مزاج دینی مزاج ہوگا۔ اگر یہ بات نہ ہو تو اس میں کمی اور کوتاہی ہوگی۔ اسی طرح اگر ہمارے دل میں یہ خیال ہو کہ ہم دوسرے سارے کام چھوڑ کر اللہ کے ذکر میں لگ جائیں تو یہ اللہ سے ہمارا تعلّق مضبوط کرے گا، اللہ کے دین کا حق ادا ہوگا، خشیتِ الٰہی پیدا ہوگی، خشوع وخضوع پیدا ہوگا، ایک خاص کیفیت حاصل ہوگی، ایک نور ہمارے دل میں پیدا ہوگا۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو اسلام میں مطلوب نہیں ہے۔ ان دونوں چیزوں کو ملا کے، جوڑ کر بلکہ جذب کر کے، وہ مزاج بنتا ہے جس کا ذکر اس سورہ میں کیا گیا ہے۔

ایک دفعہ اگر یہ مزاج پیدا ہوجائے، تو بہت ساری خرابیاں دور ہوسکتی ہیں جو ہماری نظروں کے سامنے آتی ہیں کہ لوگوں کے قلب ونظر مختلف چیزوں کے اندر اٹک کر رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح اپنے اس مقصد کو جس کو انھوں نے اپنا مقصد زندگی قرار دیا ہے، اور جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ ساری زندگی میں غالب فکر ہوگی، اور ساری زندگی کا مطمحِ نظر، اور پسند وناپسند کا معیار اللہ کی رضا ہوگی ـــــ یہ چیز بھی حاصل ہوسکتی ہے اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور اس کی کتاب کے ساتھ تعلّق زندہ ہو، اور دل ودماغ کے اندر اس کی یاد موجود ہو، نیز ہر کام میں نظر اور توجہ اسی کی طرف رہے۔ میری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو اپنی انفرادی زندگی میں بھی اور اجتماعی زندگی میں بھی صحیح معنوں میں اسے یاد رکھنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین!

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

❖❖❖